حافظ صفوان محمد

شبِ سیاہِ غلامی میں نور کی قندیل

برصغیر کے ایک بہت بڑے مستغرب نے ایک بار آخرت کے لئے اپنے زادِ راہ کے بارے میں کہا۔ "جب اللہ مجھ سے یہ پوچھے گا کہ دنیا میں آخرت کے لئے کیا سامان کیا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس حالی (مدوجزر اسلام) لکھوا کر لایا ہوں" مدوجزر اسلام کا اسم بامسمّیٰ ہونا قطعاً لاریب ہے۔ لیکن اگر یہی سوال مجھ سے ہُوا تو میرا جواب یہ ہوگا۔ "اے اللہ میں نے شاہ جی کی صحبت اگرچہ نہیں پائی لیکن ان کے مشن کو حق سمجھا۔ ان کے افکار پر غور و فکر اور ان کے ارشادات پر عمل کرنے میں اپنی سی سعی ضرور کی۔

یہ تقریباً ساٹھ برس ادھر کی ایک بہت خاموش وسطِ شب کا واقعہ ہے کہ فضاء اچانک نعرہ ہائے تکبیر فلک شگاف صداؤں سے لرز اٹھی۔ پھر اہل لاہور نے دس بارہ ہزار افراد کے ایک ہجوم کو باغبان پورہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اسی ہجوم پر ایک نظر ڈالنے سے نگاہ چمکتی ہوئی، بڑی بڑی آنکھوں، سرخ و سفید نورانی چہرہ، ملگجی ڈاڑھی، اور لمبے بالوں والے ایک کھدر پوش بزرگ پر جا کر رک جاتی تھی۔ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے جو ابھی چار گھنٹے قبل نمازِ عشاء پڑھانے کے بعد لوگوں سے چند باتیں کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ تھوڑے سے لوگ ایک بڑے مجمع میں بدل گئے۔ بات انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل سے متعلق تھی۔ جس پر الزام تھا کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عالی میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ پرنسپل کی اس مذموم حرکت پر چند غیور مسلمان طبہ مشتعل ہو گئے۔ اور اس اشتعال نے بڑھتے بڑھتے چند ہی روز میں ایک بڑی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی قیادت کی پاداش میں مولانا احمد علی لاہوری، اور مولانا داؤد غزنوی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ رات کے کوئی ایک بجے کا عمل ہوگا۔ جب ناموسِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ایک مدلل اور متنوع تقریر لوگوں کو تڑپا رہی تھی۔ پھر ایک مجمع اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ طے یہ پایا تھا کہ نمازِ فجر کالج کے سامنے ادا کی جائے اور وہیں سے ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لئے اپنا فرض ادا کرنے کا آغاز کیا جائے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس کے قدم انجینئرنگ کالج کی بجائے اپنے گھر کی طرف اٹھے ہوں۔

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنہیں چاہنے والے شاہ جی اور ماننے والے مجدد خطابت، سلطان المتکلمین، امام المجاہدین، سید الاحرار اور مؤسس تحریک تحفظ ختم نبوۃ کہتے تھے۔ یکم ربیع الاول (یعنی چاند رات) ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء کو جمعہ کی سرِ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ددھیال سے عطاء اللہ اور ننھیال سے شرف الدین احمد نام تجویز ہوا۔ والد گرامی کا نام سید ضیاء الدین اور دادا کا نام سید نور الدین شاہ تھا۔ نسب نامہ چھتیسویں پشت میں حضرت سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے خلف الرشید حضرت سید ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ العالی کی تالیف "سواطع الالہام" کے مطابق آپ کے

خاندان میں سید الاولیاء حضرت سید عبدالقادر جیلانی اور سید محمد شاہ جیسے جلیل القدر بزرگ ہو گزرے ہیں۔ ایک اور خدا رسیدہ بزرگ سید عبدالرسول تھے۔ جن کے بارے میں مؤرخ کشمیر منشی محمد دین فوق نے لکھا ہے۔ "تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مرغی کا انڈہ اور مرغی صرف اس لئے نہیں کھاتے تھے کہ یہ دانہ دنکا لوگوں کے گھروں میں بھی جا کر کھا لیا کرتے ہیں" شاہ جی کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی کا شجرہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔

۱۹۱۴ء تک آپ نے قرآن پاک کے حفظ کے ساتھ ساتھ صرف و نحو اور فقہ کی بعض کتب کی تعلیم مکمل کی۔ اسی سال آپ کا عقد آپ کے والد کے چچیرے بھائی سید مصطفیٰ شاہ کی دختر گرامی سے ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں آپ نے امرتسر کو مستقر بنالیا۔ اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ آغاز تعلق کے ایام کے بارے میں فرماتے تھے کہ "اس زمانہ میں بے حد وظائف کرتا تھا۔ طبیعت میں بہت جلال تھا۔ جب کہیں گزرتا تھا تو درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی نظر آتی تھیں" اسی زمانے میں شاہ جی حضرت مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کے درس میں شامل ہوئے۔

شاہ جی کے قرآن مجید پڑھنے کا منفرد انداز جب عام ہوا تو یہ آواز گلی کوچوں پھر شہر کے بازاروں تک آن پہنچی۔ جب لوگوں نے حضرت قاسمی کو مجبور کیا کہ وہ سید عالی کو کھلے میدان میں تقریر کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقریر اندرون گلوالی دروازہ بازار کمہاراں امرتسر میں ہوئی۔ ایک اور صاحب آپ کو نواحی قصبہ سلطان ونڈالے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں خلافت کانفرنس امرتسر کے گول باغ میں منعقد ہوئی جس میں پہلی مرتبہ شاہ جی نے سیاسی تقریر کی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستانی حنفیہ پولیس کی جانب سے تیار کردہ ایک فتویٰ پر مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے مقتدر علماء سے اس مضمون کے دستخط حاصل کئے گئے تھے کہ آلِ عثمان خادمِ حرمین شریفین ہونے کے باوجود برطانوی استعمار سے برسر جنگ ہونے کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہیں۔

رولٹ ایکٹ کی وجہ سے ملک کی سیاسی فضا میں ایک گونہ ارتعاش اور حدت پیدا ہوئی جس سے متاثر ہو کر مسلمانانِ ہند نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ اپنے جیالے رضا کار اور بہترین دماغ پروانہ وار فدا کر دیئے۔ چند ہی یوم میں یہ عوامی تحریک محلات اور کوٹھیوں سے جھونپڑیوں، مساجد، پاٹھ شالاؤں اور گوردواروں تک پھیل گئی۔ ایسے ہمہ گیر جذباتی دور سے ناممکن تھا کہ شاہ جی متاثر نہ ہوتے۔ جوانی کا عالم تھا۔ قدرت نے خوش روئی کے علاوہ خوش گلوئی کی نعمت بھی ودیعت کر رکھی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۹ء کا واعظ اور خطیب تمام آسائشوں کو تیاگ کر میدان عمل میں اس بے جگری سے کود پڑا کہ ماضی قریب، بعید کے بزرگان عظمت و استقلال کی درخشندہ تاریخ کو ایک نعرۂ عشق سے روشن اور اجاگر کر دیا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی محلے کی مسجد سے اٹھا کر انہیں سیاست کی سٹیج پر لے آئے۔ اور ابھی چند ماہ نہ گزرے تھے کہ حضرت شاہ جی کی شہرت اکنافِ ہند میں پھیل گئی۔

سیاسی اور اصلاحی مدوجزر میں وہ کون سا مقام آیا جہاں کلمۂ حق کو ببانگ دہل بلند کرنے کی حاجت ہوئی اور یہ شیر خدا نتائج سے یکسر بے نیاز ہو کر وقت کے فراعنہ اور نمارود سے نبرد آزما ہونے کے لئے سب سے اونچے مقام پر نہ دیکھا گیا ہو۔ آزادی کی جنگ ہو یا انگریز کی اسلام دشمنی کے خلاف جہاد، سردار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس پر حملوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہو یا بدعات کے خلاف تحریک۔ شاہ جی کا عمل سرفروشی کے لباس میں معاصرین میں سب سے زیادہ افضل اور مؤثر نظر آتا ہے۔ فتنہ شاتم رسول ﷺ راج پال ہو یا مغلپورہ ایجی ٹیشن، کوئٹہ کے مفلوک الحال زلزلہ زدگان کی امداد ہو یا بے کس و مظلوم مسلمانان کشمیر پر ڈوگرہ شاہی مظالم، انتخابات کی سرگرمیاں ہوں یا تحفظ ختم نبوۃ کے لئے جان کی بازی، غرض ہر مقام اور ہر منزل پر شاہ جی سالار قافلہ کی حیثیت سے رجز خوانی کرتے ملے۔ اور ساتھیوں اور جانبازوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ سزا کو ہنستے ہوئے قبول کرتے نظر آئے۔ وہ ایک ایسے بے باک اور مضطرب دل لے کر آئے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا۔ ان کی آواز اتنی پُردرد تھی کہ برصغیر اور بلاد اسلامیہ کے لئے بے اختیار بلند ہو جاتی۔ آنکھیں عالم اسلام کی ہر تکلیف پر اشک آلود ہو جاتیں۔ ناممکن تھا کہ مظلوم کو شکنجہ میں جکڑا دیکھ کر خاموش رہیں۔ وہ قوم کی تکلیف پر خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔ انہوں نے مصر، ترکی، حجاز الغرض ہر خطہ کے مسلمانوں پر ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور ان کے مصائب و آلام پر نوحہ خواں ہوئے۔

زور خطابت کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو ہمارے زمانے کے لوگ شیکسپیئر کے ڈارمہ جولیئس سیزر میں انتونی کی تقریر پر سر دھنتے نظر آتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس تقریر کا حقیقت میں کتنا اثر ہوا تھا۔ لیکن سب اپنے اور غیر بارہا اس بات کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ ناموافق ماحول میں جب بھی شاہ جی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے عوام کے غم و غصہ کو نعرہ ہائے تحسین و آفرین میں بدل دیا۔ جو لوگ جوتے لے کر آئے تھے۔ اپنی جیب سے آخری پائی تک نچھاور کر بیٹھے۔ جو کفر کا فتویٰ صادر کر چکے تھے پھر ان کے ہاتھ تاحیات دعا کے لئے اٹھے رہے۔ ایک بار شاہ جی نے فرمایا۔ "میں وہاں چلا جاؤں گا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پھر تم مجھے پکارو گے لیکن تمہاری آواز تمہارے ہی کانوں سے ٹکرا کر تمہیں لہولہان کر دے گی۔ مگر تم مجھے نہ پا سکو گے" حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی دل و دماغ پر حکمرانی کرتے تھے۔ وہ واحد شخص تھے جو سیاسی اقتدار، جماعتی رقابت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا جادو رکھتے تھے کہ لوگ فقط ایک اشارہ پر سر دینے کو تیار ہو جاتے۔ بخاری کی تقریر کسی بستی میں ہو اور لوگ رات گھروں میں سو کر گزاریں۔ یہ ممکن نہ تھا۔ آپ نے فصاحت و بلاغت، خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز کے شاہی قلعہ پر مرکوز کئے تھے۔ اختلاف عقیدہ کے علاوہ کادیانیوں سے غیر فانی کد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بانیٔ سلسلہ مرزائیت (مرزا غلام قادیانی) نے انگریزی حکومت کو ابر رحمت قرار دے رکھا تھا (ازالہ اوہام ص ۱۳۲) اس وجہ سے انگریزی استعمار اور مرزائیت دو ایسے نشانے تھے جن پر حضرت شاہ جی کے میزائل ہمیشہ لگتے رہے۔ قادیانیت کا ابطال دراصل ختم نبوت کا اثبات ہے جو آپ کے ایمان کا مرکز تھا۔ وہ حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل کے سر پر

پڑتی اسے شق کر ڈالتی۔ وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھے کہ کفر و ضلالت کے جس خرمن پر پڑتے۔ اسے بھسم کر ڈالتے۔ وہ لحن داؤدی کا ایسا نمونہ تھے کہ حبیب و رقیب سب کو مسحور کر دیتے۔ وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان پڑ جاتی۔ جس کی ایک آواز پر پچاس ہزار رضاکار آزادیٔ کشمیر کے لئے سر پر کفن باندھ کر نکل آئے۔ جس کے ایک اشارے پر متحدہ ہند کے جیل خانے بھر جاتے جس کا داخلہ ایوان مرزائیت قادیان میں زلزلہ ڈال دیتا۔ جنگ آزادی کے کارکنان سے پوچھیئے کہ ان کی امروہہ والی تقریر ضرب المثل کے طور پر آج بھی یاد کی جاتی ہے کہ اس نے جنگ آزادی کو نیا رُخ دیا۔

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دنوں میں لاہور سنٹرل جیل میں جب مارشل لاء کے قیدیوں سے آپ کی ملاقات کرائی گئی۔ تو آپ ننگے پاؤں اور ننگے سر ان کے استقبال کے لئے دوڑے۔ آپ نے سب کو گلے لگایا۔ ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو بوسہ دیا۔ اور یوں گویا ہوئے "تم لوگ میرے سرمایۂ حیات ہو۔ میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی یا پیٹ یا کسی مادی مفاد کے لئے نہیں پکارا۔ لوگ اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے تحفظ کی دعوت دی ہے۔ میں نے جب کراچی جیل میں گولی چلنے کے واقعات سنے اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے بابوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئیں، ماؤں کے چراغ گل ہو گئے، اور کئی سہاگ اجڑ گئے تو مجھے اس کا بہت صدمہ ہوا۔ میں نے وہاں کہا تھا کہ کاش مجھے کوئی باہر لے جائے یا ارباب اختیار تک میری آواز پہنچا دی جائے کہ تحفظ ناموس رسول ﷺ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا مقصود ہو تو وہ گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائے اور کاش اب تک جتنی گولیاں چلائی گئیں مجھے ٹکٹکی باندھ کر میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جاتیں۔"

راقم کے دادا مولوی محمد صدیق اسیری کے ان ایام میں شاہ جی کے ہمراہ تھے۔ ان دنوں آپ ۱۳ فروری ۱۹۵۳ء کو بیرون دہلی دروازہ والی تقریر کے سلسلہ میں اسیر تھے۔ یہ وہی تقریر تھی جس میں آپ نے اپنی ٹوپی اتار کر کہا تھا۔ "کوئی ہے تم میں جو یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین (وزیر اعظم پاکستان) کے پاؤں پر جا کر رکھ دے اور یقین دلا دے کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں۔ اگر وہ ناموس رسول کا تحفظ کریں تو میں پوری زندگی ان کا خدمت گار رہوں گا"

جلیانوالہ باغ کے حادثہ اور قبیح رسوم کے خلاف جہاد نے شاہ جی کو وہ مقام دیا کہ جہاں وعظ فرماتے انسان ہی انسان نظر آتے۔ اسی عہد میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا تھا۔ مذہب کے گرد حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرانے کے لئے شب و روز مشورے ہونے لگے۔ اور ایک ایسی جماعت کی تنظیم ہو گئی جس کے رزق کا انحصار کذب کے شجر کی آبیاری پر تھا۔ آپ کبھی کبھی بڑے جلال سے فرمایا کرتے تھے "ایک وقت آئے گا کہ تم لوگ ہماری قبروں پر آکر روؤ گے اور کہو گے کہ تمہیں لوگ سچے تھے" انہیں ایام میں ایک تقریر میں فرمایا۔

"میں ان سوروں کا ریوڑ بھی چرانے کو تیار ہوں جو برٹش امپریلزم کی کھیتی کو ویران کرنا چاہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتا ایک فقیر ہوں اپنے نانا ﷺ کی سنت پر مرمٹنا چاہتا ہوں۔ اور اگر کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس

ملک سے انگریز کا اخلاء دو ہی خواہشیں ہیں میری زندگی میں۔ یہ ملک آزاد ہو جائے یا میں تختہ دار پر لٹکا دیا جاؤں"

ایک بار ضلع سورت میں سکھوں اور ہندوؤں کی دعوت پر ایک تقریر منظور فرمائی۔ اس تقریر کی تاثیر اور حلاوت نے سکھوں اور ہندوؤں سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرائے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی بھی موجود تھے۔ اسلام کی حقانیت، اللہ کی عظمت، توحید اور بت پرستی کی قباحتوں پر حیرت انگیز بیان تھا۔

وہ بھی عجیب منظر تھا جب مئی ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین کے اجلاس میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری نے آپ کو امیر شریعت کا خطاب دیا اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے کر بیعت کی۔ حضرت شیخ خود بھی زار و قطار رو رہے تھے۔ اور شاہ جی کی آنکھوں سے بھی گویا آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔ آپ لاکھ انکار کرتے تھے اور حضرت شیخ اصرار کرتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد آپ کی شخصیت میں مقبولیت اور جاذبیت کا وہ دور شروع ہوا جو اس سے قبل کبھی نہ تھا۔

وہ حریت و مساوات کی جنس گراں بار اٹھائے زندگی کے بازاروں میں تقریباً نصف صدی تک لوگوں کو ہر لحظہ بلاتے رہے۔ انہوں نے اس گورستان میں برسوں اذانیں کہیں۔ لیکن غلام رگوں کے منجمد خون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ لاسکے۔ اور یوں یہ بدنصیب لوگ اب شاید ہمیشہ کے لئے غلام ہو گئے۔ اگر بخاری پہاڑوں کو پکارتے تو شاید خاک راہ بن کر دامن سے لپٹ جاتے۔ اگر ستاروں کو آواز دیتے تو وہ یقیناً اپنی قندیلیں زمین کے حوالے کر دیتے مگر آہ! بخاری نے ان کے دروازوں پر سر پٹخا جن کے دل خون سے تہی، آنکھیں بصارت سے محروم اور کان صدائے حق سے ناآشنا تھے۔ یا بالفاظ دیگر وہ لوگ

ختم الله على قلوبهم وعلىٰ سمعهم وعلىٰ ابصار هم غشاوة .

کی حقیقی تفسیر تھے۔ دردناک اور فلک شگاف آواز کے ساتھ قرآن کا پڑھنا، عالم و جاہل اور مخالف و موافق سب کا یکساں طور پر متاثر ہونا ان کی وہ خصوصیات ہیں کہ کوئی ان کی ہمسری کر نہیں سکتا۔ مخالفین کو ہم خیال بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو بولنے سے قبل ہی مجمع کو ایک ساحرانہ نگاہ سے مسحور کر دیتے تھے۔ اپنے مخالف پر یوں حملہ آور ہوتے کہ ایسا خطیب کسی نے دیکھا ہوگا اور نہ سنا۔ فکری تحلیل سے وہ نقشہ کھینچتے تھے کہ دنیا کا کوئی مقرر ان کی نقالی نہیں کر سکتا۔ احرار کی قیادت کے زمانہ میں آپ کے دہن مبارک میں دودھاری زبان اور باطن میں قلب جرار تھا۔ جس نے قادیانیت کا جنازہ نکال دیا۔ مولانا محمد علی جوہر کی خطابت اور قیادت دونوں مسلم الثبوت ہیں۔ ایک بار شاہ جی کے بارے میں فرمایا۔ "ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جاسکتی ہے نہ بعد میں۔ اس کے بعد تقریر کرنے والے کا رنگ نہیں جمتا اور اگر اس سے پہلے تقریر کریں تو اس کے اثر کو آکر یہ مٹا دیتا ہے"۔

لدھا رام والے کیس کے سلسلہ میں ایک گواہ سید مقبول شاہ جوان دنوں لالہ موسیٰ میں ہیڈ کانسٹیبل تھا کہتا ہے۔ "جب میں ہائی کورٹ میں شاہ جی کے خلاف شہادت دینے کے لئے گیا تو لاہور کے سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی کہ دوران شہادت شاہ جی سے آنکھ نہ ملانا۔ اگر آنکھ مل گئی تو شہادت نہ

دے سکو گے۔ یہ واقعہ حضرت مرحوم کی مقناطیسی شخصیت کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

شاہ جی دوسروں کی عیوب کی پردہ پوشی فرماتے تھے۔ کسی کی دل آزاری ان کا شیوہ نہ تھا۔ صلح کل ان کا مسلک تھا۔ ان کے منہ سے کسی نے جھوٹی بات نہیں سنی۔ وہ اس بات یا روایت کو ہر گز بیان نہ کرتے جس کی صحت میں انہیں ذرہ برابر بھی شک ہوتا۔ بے حد منکسر المزاج تھے۔ آخری ایام میں ایک بار فرمارہے تھے۔ "میری زندگی ہی کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ نہ نبی ہوں نہ ولی۔ خدا کی مخلوق میں سب سے برا اور عاجز!! میرے گناہوں پر میرے مالک نے پردہ ڈال دیا۔ ورنہ عطاء اللہ جیسے کروڑوں مارے مارے پھرتے ہیں جنہیں کوئی جانتا تک نہیں۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے قرآن کی کچھ خدمت مجھ سے لے لی۔ اور اس پر بھی کوئی دعویٰ نہیں۔ استغفر اللہ! پوری زندگی میں کہا ہوا کوئی ایک حرف بھی قبول ہو گیا تو نجات ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ۔ نجات کی امید ضرور رکھتا ہوں۔ کیونکہ اتنا مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کے سوا کسی کو خدا نہیں مانا۔ اور میاں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو ان کا حریف بنتے دیکھنا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اور کوئی عمل میرے پلے نہیں۔ بس اسی کے فضل و کرم کے سہارے جی رہا ہوں"

۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شب اہل ملتان نے یہ دلخراش خبر سنی کہ محفل عزم و عمل کا وہ چراغ جو کئی برس سے مرض و ضعف کے شدید جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا۔ ۷۲ برس کی حنا گستریوں کے بعد بالآخر آج شام چھے بج کر پچپن منٹ پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ وہ جس کے دروازے پر بڑے بڑے روسا، آفیسرز، وزراء، علماء اور صوفیاء حاضری دینا باعث صد افتخار گردانتے تھے کرائے کے ایک بوسیدہ مکان میں اپنی زندگی گزار کر خوش رہا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے جنازے یوں نہ اٹھے ہوں گے جیسے اس فقیر کا جنازہ اٹھا۔ جنازہ اٹھائے جانے کے وقت دولاکھ سے زائد خوش قسمت عقیدت مندوں نے ایمرسن کالج گراؤنڈ ملتان میں آپ کے بڑے فرزند اور جانشین حضرت ابو معاویہ ابوذر بخاری مدظلہ العالی کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی۔ ڈپٹی کمشنر ملتان نے حکومت کی جانب سے قلعہ ملتان میں تدفین کی پیشکش کی۔ جسے شاہ جی کے اہل خانہ نے مسترد کر دیا اور عام قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخری ایام میں آپ اکثر فرماتے تھے۔ "اللہ مجھے ایسے مقام پر قبر نصیب کرے جو سر راہ ہو اور آتے جاتے لوگ فاتحہ پڑھ جایا کریں" ۲۲ اگست کی شام چھے بجے جلال باقری قبرستان میں برلب سڑک آپ کو سپرد لحد کیا گیا۔ شاہ جی ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے سو گئے۔ لوگوں کی گریہ وزاری کی انتہا ہو گئی۔ برصغیر کی تحریک آزادی اور جہاد دین کا ایک نہایت منور باب اپنے اختتام کو پہنچا اور دنیا اس بلبل ہزار داستان کی نغمہ طرازیوں اور خوش الحانیوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ جو خرمن باطل پر بجلی کی مانند ٹوٹتی تھی۔

آج مٹی کا وہاں ڈھیر سا ہو گا ساغر
سر جھکاتی تھی جہاں لوح و قلم کی دنیا